ثناءاللہ سعد شجاع آبادی

''عالم دین'' کہلوانے کا شوق اور اس کی تکمیل کے اسباب

محترم رشید قیصرانی کے جواب میں

فاتح قوموں کا اپنی مفتوح اقوام کے ساتھ سلوک ہر دور میں عبرتناک ہوتا ہے۔ وہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتیں بلکہ باقی ماندہ میں سے معززین کو ہمیشہ کے لیے ذلیل کرنے کے انتظامات بھی کرتی ہیں۔ وہ ان کے صرف ہاتھ پاؤں ہی نہیں باندھتیں بلکہ ان کے ذہنوں کو بھی غیر مرئی زنجیروں سے جکڑ دیتی ہیں۔ نسل در نسل غلام پیدا کرنے کے لیے ایسا ضروری ہوتا ہے۔ حال ہی میں امریکہ نے افغانستان کو ''فتح'' کرنے کے بعد وہاں پر جو نظامِ تعلیم رائج کیا اور جو نصاب ترتیب دیا' اس پر تباہ حال افغانوں کی دبی دبی آہیں اور سسکیاں چند ماہ قبل اخبارات کے ذریعے سنائی دی تھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے برصغیر پر قبضے اور سلاطین دہلی کے انجام کو پہنچنے کے بعد انگریز بہادر نے ہندوستانی درس گاہوں سے اسلامی علوم اور فارسی زبان کو دیس نکالا دینے کے لیے ۱۸۳۴ء میں انگریزی تعلیم کا اجراء کیا۔ اس موقع پر جو نظامِ تعلیم مرتب کیا گیا' اس کا اصل موجد لارڈ میکالے تھا۔ جس نے اپنے وضع کردہ نظام کے حق میں دلائل دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا تھا ''ایک زمانہ آئے گا کہ ہندوستان مغربیت کا جامہ اختیار کرے گا اور یہ قوی امید ہے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر خیالات اور تمدن میں انگریز ہوگا۔''

یاد رہے کہ انگریز نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور میدان مزاحمت میں بھی خم ٹھونک کر مسلمان ہی آتے تھے۔ ہندو یا دیگر اقوام ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ لہٰذا انگریز نے بھی اپنی اصل ''انگریزی'' کا ہدف مسلمان ہی کو بنایا۔ دینی مدارس اور ان کے مصارف و اخراجات کے لیے قائم کردہ اوقاف و وظائف کو ختم کیا اور ۱۸۴۹ء سے ملازمتوں میں انگریزی دانوں کو ترجیح دی جانے لگی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ سرسید احمد خان نے ان حالات میں علی گڑھ میں مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دینے کے لیے مرکز قائم کیا۔ جبکہ علماء کی ایک جماعت مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کے بقاء واحیاء کے لیے میدان میں اتری اور اس نے جا بجا دینی مدارس قائم کرنے کی داغ ڈالی۔ جس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ درختوں اور دیواروں کے سائے تلے اور خستہ وخراب حجروں میں صرف ونحو، قرآن وحدیث، فقہ وکلام کی تعلیمات دی جانے لگیں۔ جگہ جگہ یہ حلقہ ہائے علم وتعلیم ان پیکرانِ علم وعرفان اور زہد وتقویٰ کی سرپرستی میں جاری ہوئے جن کی آمدنی کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ یہ لوگ کئی کئی وقت کے فاقے برداشت کرجاتے، سوکھوں ٹکڑوں کو پانی میں بھگو کر پیٹ میں اتار لیتے، کئی کئی میل کے فاصلے پر جاکر مسلمانوں کی بچی کھچی روٹیاں لاکر کھاتے مگر ''قال اللہ وقال الرسول'' کی صداؤں میں مگن رہتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہی فاقہ کشوں نے غلام

برصغیر کے لیل ونہار کو اپنے خون جگر سے سینچ کر اسے غاصب انگریز سے آزادی کے شمسِ بازغہ سے منور کیا ہے۔ پاکستان میں بھی ان لوگوں نے جدیدیت و مغربیت اور الحاد و کج روی کے سارے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے قرآن و سنت کی ٹھوس تعلیم کا بندوبست کیا ہے اور کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کے ایسے ماہرین مسلسل پیدا کیے ہیں جن کے علم و فضل اور دیانت و امانت پر قوم اعتماد کر سکے۔ چنانچہ عام مسلمانوں نے دینی مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ ایسے "علماء دین" ہی سے رجوع کیا ہے جو دینی مدارس سے مستفید ہوں۔ جبکہ لارڈ میکالے کے فیض یافتگان اور وابستگان و فرہنگان کی نظر میں علوم نبوت کے یہ ماہرین اتنی رذیل و گھٹیا مخلوق ہیں کہ نہ کسی نظام کی اصلاح کے لیے ان سے مشورہ لیا جا سکتا ہے نہ جدید درس گاہوں میں علوم نبوت کی تدریس ہی کا انہیں اہل سمجھا جاتا ہے۔ جب تک کہ ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹریٹ یا بی اے اور ایم اے کا سابقہ و لاحقہ نہ ہو۔ انگریزی تہذیب میں رچے بسے ہوئے مسلمان بالخصوص جب مناصب و اقتدار پر براجمان ہوتے ہیں تو حصہ بقدر علماء دین کو اپنی چاند ماری کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ ان کی ڈگریاں تعصب و تفاخر اور غرور و تکبر کی دستاویز بن چکی ہیں۔ اور ان کی حقارت و تذلیل کا نشانہ وہی علماء دین بنتے ہیں جنہوں نے ان کی بھرپور اعتنائی کے باوجود ان کے تشخص کو برقرار رکھا ہے۔

ایوب خان کے دور حکومت میں ایک ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے ایک تحصیل کا دورہ رکھا اور لوگوں سے کہا کہ اپنے علاقہ کے شرفاء کے نام پیش کریں۔ کسی منچلے نے ایک مولوی صاحب کا نام بھی پیش کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے پوچھا ان کی تعلیم؟ جواب ملا "حافظ قرآن ہیں۔" ڈپٹی صاحب نے کہا کہ "بھئی میں ان کی تعلیم پوچھ رہا ہوں۔" جواب ملا "یہ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ماہر عالم دین ہیں۔" ڈپٹی صاحب نے پھر کہا "میاں! میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ ان کی تعلیم کیا ہے؟" جواب ملا "یہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور سند یافتہ ہیں۔" اب ڈپٹی صاحب نے تیز لہجے میں کہا کہ "میں یہ دریافت کر رہا ہوں کہ یہ پرائمری یا مڈل پاس ہیں یا انہوں نے میٹرک کیا ہے۔ میں تعلیم پوچھ رہا ہوں۔"

یہ لطیفہ یا واقعہ اس زمانے کا ہے جب علماء کرام کی سندات کو پاکستانی قوانین کی رو سے فی الواقع کوئی حیثیت و اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی علماء کرام کا عوام میں اس قدر اثر و رسوخ حاصل تھا کہ حکومت کے تجدد پسندانہ عزائم کے خلاف علماء کی ایک ہی کال پر پورے ملک میں احتجاج کی لہر اٹھ کھڑی ہوتی اور حکومتیں اپنی ناکامی پر بوکھلا اٹھتی تھیں۔ صدر ایوب کو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ کراچی سے پشاور اور ڈھاکہ سے سلہٹ تک ہلچل برپا ہو جاتی ہے، چنانچہ اسلامیہ کالج پشاور کے "ڈین" صاحب کو اس غرض سے مصر بھیجا کہ وہ جائزہ لیں کہ حکومت مصر نے علماء پر کس طرح کنٹرول کیا ہوا ہے، تاکہ اس کی روشنی میں پاکستانی علماء کو پابند رکھنے کی منصوبہ بندی کی جا سکے، چنانچہ ڈین صاحب مصر تشریف لے گئے اور واپسی پر تمام مساجد اور مدارس عربیہ کو حکومتی تحویل میں لے لینے کا نسخہ تجویز فرمایا۔ ایوب صاحب نے مدارس عربیہ پر قبضہ کرنے کا عزم مصمم فرما لیا تو ڈین صاحب گویا ہوئے "حضور! مصر اور پاکستان کے حالات مختلف ہیں، ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر ہم مدارس کو حکومت کے قبضے میں لے لیں تو مولانا محمد یوسف بنوری جیسے علماء مدارس کی بجائے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔ عرب ممالک میں تو عوام کو مدارس میں چندہ دینے کی عادت نہیں مگر پاکستان میں ایسے علماء ہیں کہ اگر

انہوں نے مساجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تو عوام اور مخلصین انہیں بغیر رسید کے چندہ دیں گے اور مسجدوں میں پھر سے نئے آزاد مدرسے قائم ہو جائیں گے، حکومت کے سرکاری مدارس میں تو دینی علوم پڑھنے کوئی نہیں آئے گا، اس طرح ہمارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔''

صدر ایوب نے ڈین صاحب کو دینی مدارس کے لیے نیا نصاب تعلیم بنانے کا حکم دیا، ڈین صاحب حیدر آباد یونیورسٹی کے داؤد پوتا صاحب کے ہمراہ کراچی تشریف لے گئے اور مولانا محمد تقی عثمانی کے والد مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور جامعہ علوم اسلامیہ کے مہتمم مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے ملاقات کی اور انہیں نصاب تعلیم میں ترمیم کا مشورہ دیا۔ مولانا بنوریؒ نے انکی پوری تقریر سن کر فرمایا

''مدارس عربیہ کا نصاب تعلیم کون بنائے گا؟ حدیث، تفسیر اور فقہ کے نصاب مرتب کرنے میں' آپ جیسے سرکاری ملازمین کی کیا حیثیت ہے؟ نصاب تو علماء راسخین ہی بنا سکتے ہیں اور وہی بنائیں گے۔''

ڈین صاحب بولے وہ علماء راسخین کون ہوں گے؟

آپ نے فرمایا ''یہ کام یوسف بنوری اور مفتی محمد شفیع صاحب کا ہے، آپ کون آئے نصاب بنانے والے۔''

(اشاعت خاص ماہنامہ بینات کراچی محرم ۱۳۹۸ھ)

آج بھی یہ حقیقت ہے کہ ہمارے علماء ''دینیات'' میں اس قدر مہارت رکھتے ہیں کہ بغیر کسی فخر و مباہات کے کہا جا سکتا ہے کہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کا کوئی پی ایچ ڈی بھی دوران درس جا کر ان کی شان علمیت کو جانچے تو خود کو طفل مکتب تسلیم کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے متقدر طبقہ کو بالآخر درس نظامی کے فضلاء کی سندات کو ایم اے عربی و اسلامیات کے مساوی تسلیم کرنا پڑا۔ اور پاکستان کے عوام جو علماء اسلام کے پہلے ہی سے قدر دان تھے۔ انہوں نے افغانستان کے بہانے پاکستان پر حالیہ امریکی یلغار کے بعد علماء امت ہی کو ملک و ملت اور اسلامی تہذیب و تمدن کا امین گردانتے ہوئے اکتوبر ۲۰۰۲ء کے الیکشن میں بھاری اکثریت سے کامیاب کرا کر قومی اسمبلی کے ایوان تک پہنچا دیا، یہ بات ہمارے جدید تعلیم یافتہ مہربانوں سے برداشت نہیں ہو پا رہی۔ چنانچہ اب ایک بار پھر ہمارے ارباب علم و دانش کو مولوی اور عالم دین کے حوالے سے کچھ نئے خیالات سوجھنے لگے ہیں۔ جناب رشید قیصرانی نے ۲۸ دسمبر ۲۰۰۲ء بروز ہفتہ کے روزنامہ ''جنگ'' ملتان کے ذریعے ایک سوال خوبصورت چوکھٹے میں ٹانک کر پیش فرمایا ہے کہ ''جب ہمارا دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسانی حیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے تو پھر عالم دین کی اصطلاح صرف ایک مخصوص طبقے کیلیے کیوں استعمال کی جاتی ہے، ایک مسلمان ڈاکٹر یا سائنسدان یا ماہر اقتصادیات کو ہم عالم دین کیوں نہیں کہتے؟''

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ قیصرانی موصوف کو ''عالم دین'' کی اصطلاح پر قابض ایک ''مخصوص طبقہ'' سے حسد پیدا ہونے لگا ہے' البتہ یہ ضرور کہیں گے اس سوال کے ذریعے موصوف نے اپنی علمیت ضرور آشکار کر دی ہے۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت میں انہی کی بلائی گئی ''اجتہاد کانفرنس'' میں اندرون و بیرون ملک کے بڑے بڑے

سکالرز نے ضرورت اجتہاد کے موضوع پر اپنے علمی مقالات پیش فرمائے۔ سامعین کی بڑی تعداد ججوں اور وکلاء پر مشتمل تھی۔ مفتی محمودؒ کو بھی مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن مفتی صاحب نے مقالہ پڑھنے کی بجائے فی البدیہہ تقریر کی اور دوران تقریر فرمایا:

''اصول فقہ میں اجتہاد کی بڑی بڑی شرائط ذکر کی گئی ہیں' مگر میں ان شرائط کو نظر انداز کرتا ہوں' لیکن اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجتہد کے لیے کم از کم ناظرہ قرآن پڑھے ہوئے ہونے کی شرط تو ہونی چاہیے۔''

اور پھر پہلی صف میں کرسی نشین ان عدل وانصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا'' پہلے ان کو ناظرہ قرآن تو پڑھوالو۔'' مفتی صاحب کے اس فقرے پر جج صاحبان کے منہ لٹکے رہ گئے۔

قیصرانی صاحب! آپ کو بذات خود عالم دین کہلوانے کا شوق ہے یا جن اوصاف سے متصف ماہرین کو آپ ''عالم دین'' بھی کہلوانا چاہتے ہیں' اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ سنت رسول اپنے چہرے پر سجالیں' ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ لوگ آپ کو عالم دین کہہ ہی دیا کریں گے۔ ورنہ اس شوق کی تکمیل بہت مشکل ہے۔ کیونکہ جس شخص کو علم دین کی اصطلاح کے بارے میں واجبی سا علم بھی نہ ہو' اسے عالم دین کہا جائے تو کیونکر؟ یاد رکھیے! دین ایک ''کُلّی'' کا نام ہے اور آپ کی پیش کردہ اصناف محض جزئیات ہیں۔ کسی ایک جزئی کی مہارت سے کوئی آدمی ''کُلّی'' میں ماہر کیسے ہوسکتا ہے؟ جبکہ وہ باقی تمام جزئیات سے قطعی کورا ہو۔ یہ تو ایک عام قاعدے کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دین کی محبت سے سرشار ہو کر اور اس پر ایک مخصوص طبقے کی ''اجارہ داری'' سے نالاں ہو کر آپ اپنے بارے میں عالم دین کہلوانے کے استحقاق کی دلیل دے رہے ہیں، اسی دین کے پیامبر ﷺ نے جس ''علم'' کو فرض قرار دیا، جس کے فضائل ومناقب ارشاد فرمائے اور دور دراز کے سفر کی تلقین کی' اس سے مراد محض فرائض (قرآن وحدیث) کا علم ہے۔ اور ''علم'' کی اصطلاح بھی محض اسی کے لیے وضع فرمائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام ''فنون'' اور ''ہنر'' ہیں' جنہیں بقدرِ ضرورت سیکھنا جائز قرار دیا ہے۔ جس قدر انسانی ضروریات بڑھتی جائیں گی' اسی قدر ان کا سیکھنا جائز ہوتا چلا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ انسان کی معلومات' جس قدر اس دنیا اور اس کے حقائق پر زیادہ ہوں گی۔ اسے دین میں اتنی ہی زیادہ بصیرت حاصل ہوسکے گی۔ بشرطیکہ وہ کسی ایک پر اَڑ کر نہ رہ جائے۔ جو شخص علم ہیئت، کیمیا، طبیعات وغیرہ کے ذریعے سے ''دنیا کا علم'' خوب حاصل کرلے' اس پر دینی اصطلاحات جاری نہیں ہوسکیں گی۔ جب تک وہ قرآن وحدیث اور اس کے معاون علوم پر دسترس حاصل نہ کرلے۔ خلاصہ یہ کہ جو بھی صاحب عالم دین کہلوانے کا شوق رکھتے ہیں۔ انہیں قرآن وحدیث کے سامنے اپنے قیمتی اوقات اور ذہنی صلاحیتیں نچھاور کرنا ہوں گی۔ پھر ان کی برکت سے رب ذوالجلال ان کے قلوب واذہان کو علم دین کے نور سے منور کر کے عالم دین بنادے گا۔ بصورت دیگر ؎

ایں خیال است ومحال است وجنوں!